R. No. 2186/57 Regd. No. L. 522.

انجمن ترقی اُردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Phone—29
Annual Rs. 4/-
Per Copy-12 P.

Date
1-8-15-22

جلد ۲۶ ۔ شمارہ ۲۰	ایڈیٹر: آل احمد سرور	۲۲ رمئی ۱۹۶۷ء

اداریہ

کچھ بنیادی حقایق

عام چناؤ کے بعد جب کچھ ریاستوں میں غیر کانگریسی حکومتیں بنیں تو بہت سے اردو دوستوں کو یہ امید بندھی کہ اب اردو کے ساتھ انصاف ہوگا اور اردو دوستوں کا اتر پردیش اور بہار میں سرکاری زبان کی حیثیت سے اردو کو تسلیم کرنے کا مطالبہ منظور کر لیا جائے گا۔ لیکن اب حالت یہ ہے کہ اگرچہ ان حکومتوں کے پیچھے کچھ پارٹیوں نے اردو دوستوں کے اس مطالبے کو تسلیم کر لیا تھا اور ان حکومتوں کے بنتے وقت اس کا اعلان بھی ہوا تھا، مگر اب جن سنگھ کی مخالفت کی وجہ سے یا اخلاقی کمزوری کی وجہ سے یہ حکومتیں ٹال مٹول کر رہی ہیں۔ ہم نے پہلے بھی کہا تھا اور پھر اسے دہرانا ضروری سمجھتے ہیں کہ ایک طرف اردو دوستوں کو یہ خوش فہمی نہ ہونی چاہیے کہ جو جماعتیں کانگریس کی مخالف ہیں وہ اردو کے ساتھ انصاف ضرور کریں گی، دوسری طرف یہ بھی نہیں سمجھنا چاہیے کہ کانگریس ہی بالآخر اردو کا حق تسلیم کرے گی، یا کانگریس ہرگز ایسا نہیں کرے گی بلکہ جو لوگ اردو کی حمایت کرتے ہیں ان کو سراہتے ہوئے یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ مختلف وجوہ سے جن علاقوں میں ہندی کا رواج ہے یا جہاں فرقہ واریت کا خاصا زور ہے، وہاں اکثریت کچھ تعصب اور کچھ بے نیازی کی وجہ سے اردو کو اس کا حق دینے کو تیار نہیں ہے۔ اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے معنی قوم و ملک سے مایوس ہو جانے کے نہیں، بلکہ اکثریت کو اس کا فرض یاد دلا کر، اس کے ذہن کو کشادہ کر کے، اسے حقائق سمجھا کر راہ راست پر لانے کے ہیں۔ یہ کام دیر طلب ضرور ہے مگر ہو سکتا ہے اور ہونا چاہیے۔ لیکن اس سے زیادہ ضروری کام یہ ہے کہ اپنے اپنے حلقے میں اردو دوست ابتدائی و ثانوی منزل پر اردو کے ذریعہ سے تعلیم دینے کے لیے اپنے ادارے کھولیں اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے علاقے کے قومی اداروں میں اردو کی تعلیم کے لیے پارلیمنٹ کے ممبروں، قومی کارکنوں، اسمبلی کے ممبروں، بااثر حضرات کی مدد لیں۔ آج کل دوسرے اسی وقت مدد کرتے ہیں جب وہ دیکھتے ہیں کہ جس کا کام ہے وہ بھی کچھ کر رہا ہے۔ اردو دوست اب بھی حکومت یا کسی سیاسی پارٹی کی طرف دیکھتے ہیں۔ یہ غلط بات ہے حکومت اور سیاسی پارٹیوں کو ان کا فرض یاد دلانا چاہیے، مگر اس انتظار میں بیٹھے نہیں رہنا چاہیے کہ وہ سرکاری زبان کی حیثیت سے اردو کو تسلیم کر لیں تو ہمارا کام چل نکلے۔ ہمیں سب محاذوں پر ایک ساتھ لڑنا ہے، حکومت کو اس کا فرض یاد دلانا ہے سیاسی پارٹیوں کو جتانا ہے کہ ان کے قول و فعل میں تضاد نہیں ہونا چاہیے اردو کا کیس علاقائی زبانوں میں، ہندی میں اور انگریزی میں دلائل کے ساتھ برابر پیش کرنا ہے، مگر اردو دوستوں کو پست ہمتی، احساس شکست، بے حسی، ابن الوقتی سے بھی نکالنا ہے اور انھیں یہ یاد دلانا ہے کہ کوئی کچھ کرے یا نہ کرے انھیں اپنے بچوں کو ہر حال میں اردو پڑھانا ہے۔ آج کل اقتصادیات کی سب سے زیادہ اہمیت ہے۔ اس لیے ایک طرف اردو دوستوں کو اپنی اقتصادی حالت بہتر بنانا ہے تاکہ وہ آج کے مقابلے کے دور میں اپنے لیے جگہ بنا سکیں، دوسرے انھیں اس طرف مائل کرنا ہے کہ وہ اردو کے تعلیمی اداروں کو خود چلائیں اور ان کا خرچ خود برداشت کریں، تیسرے انھیں اپنے کاروبار میں اردو جاننے والوں کو ترجیح دینا ہے تاکہ اردو جاننے والوں کو ملازمت بھی مل سکے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ صرف حکومت اردو کو سرکاری زبان تسلیم کر لے پھر ساری مشکلات حل ہو جائیں گی، وہ بڑے دھوکے میں ہیں۔ آخر اعلان پر عمل بھی کوئی چیز ہے اور اس بے نیاز اور بے پروا حکومت یا اکثریت سے یہ توقع کہ وہ ایمانداری سے ہر اعلان پر عمل کرے گی، خوش فہمی نہیں تو اور کیا ہے۔ عمل بھی ہمیں ہی کرانا ہوگا۔ اس لیے حقیقت پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم سہل نسخوں اور چھوٹے راستوں کی طرف تکنا چھوڑ دیں۔ لمبا اور مشکل اور دور رس پروگرام اپنائیں، قومی کاموں میں کھلے دل سے شرکت کریں، علاقائی زبانوں کی حمایت کریں، مگر ہر حال میں دیکھتے رہیں کہ اردو کے لیے ہم خود کون سے ٹھوس اور عملی قدم اٹھا رہے ہیں اور دوسروں کو اردو کے لیے کچھ کرنے پر کہاں تک آمادہ

کر سکتے ہیں۔ کام بڑا ہے اور لمبا ہے، مگر کرنے کا ہے اور ہم کر بھی سکتے ہیں۔" (باقی)

بنگلہ مصنف کو جن پیٹھ انعام

بنگلہ زبان کے مشہور ناول نگار جناب تاراشنکر بنرجی کو ۱۹۶۶ء کا جن پیٹھ انعام ملا ہے۔ یہ انعام مصنف کے ناول "گن دیوتا" پر دیا گیا ہے۔ انعام کی مجموعی رقم ایک لاکھ روپیہ ہے۔ اس ادارہ کے صدر شری سمپورنانند ہیں۔ جنھوں نے اس انعام کا اعلان چند روز قبل اخباری نمائندوں کی ایک پریس کانفرنس میں کیا تھا۔

جے پور کے اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی سرگرمیاں

جے پور۔ یہاں پہنچنے والی اطلاعات کے مطابق اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے اب تک ۲۰ جلدیں شائع کی ہیں۔ یہ انسٹی ٹیوٹ ۱۹۵۰ء میں قائم کیا گیا تھا اور وہ اب تک ۵۵ ہزار نادر مسودے جمع کر چکا ہے اور اس میں ہر سال تین ہزار سے پانچ ہزار تک کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ انسٹی ٹیوٹ انھیں ترتیب وار سائنسی طریقوں سے محفوظ رکھنے کا بندوبست کرتا ہے۔ انسٹی ٹیوٹ خاص طور پر تاریخی تحقیق کا کام کر رہا ہے۔ (قائد)

ہندوستانی کلاسکوں کا جرمن ترجمہ

بون۔ پچھلے دنوں وفاقی جمہوریہ جرمنی میں سنسکرت علم و ادب کی ایک مشہور مصنف کے چند چیدہ نمونوں کا ایک مجموعہ شائع ہوا ہے جو یونیسکو کے سلسلے "عالمی ادب کے شہ پارے" کی ایک نئی کڑی ہے۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ جرمن زبان میں اپنشدوں کا ایک عمدہ انتخاب پیش کرتی ہے۔ ہندوستان کی ان کلاسیکی تصانیف کا یہ اعلیٰ ترجمہ خاص طور سے وفاقی جمہوریہ جرمنی کے ان لوگوں میں بہت مقبول ثابت ہوگا جو ہندوستان کے مذہبی و فلسفی خیالات سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس سے پہلے یونیسکو کے اسی سلسلے کے تحت رگ وید کے بعض حصوں کا بھی ایک جرمن ترجمہ شائع کیا جا چکا ہے۔

۱۹ ویں صدی کی شاعرہ نادرہ کی شاعری کا مجموعہ

دوشنبہ، ۷ مئی۔ فرغانہ کی ۱۹ ویں صدی کی شاعرہ نادرہ کا شعری ورثہ مشرقی ادب عالیہ کے شیدائیوں کی دسترس میں آجائے گا۔ تاجک اشاعت گھر "عرفان" ان کی شاعری کا ایک مجموعہ شائع کر رہا ہے جو تاجک اور ازبک زبانوں میں ہے۔

نادرہ کی تخلیقات اور حیثیت کی خوبیاں نے نقادان فن کو اپنی طرف مائل کیا۔ نادرہ کی ۱۷۵ ویں سالگرہ اسی سال منائی جائے گی۔ ان کی شاعری کا روحانی انسانی نازک تبدیلیوں اور گہرے سماجی مسائل دونوں کی عکاسی کی گئی ہے۔

نادرہ کی تخلیقات کے جستجو و مطالعہ میں ۲۰ برسوں کا وقت صرف ہوا۔ ادبی اسکالروں کے نزدیک نادرہ کی تخلیقات کی اشاعت مشرقی شعری تاریخ میں ایک اہم اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

سری نگر میں آل انڈیا یونیورسٹی اردو ٹیچرز کانفرنس

نئی دہلی۔ آل انڈیا یونیورسٹی اردو ٹیچرز ایسوسی ایشن کی دوسری سالانہ کانفرنس جموں و کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی دعوت پر ۲۳ جون سے ۲۵ جون تک سری نگر میں منعقد ہوگی۔

مجوزہ کانفرنس میں صرف اردو سے متعلق تعلیم اور تحقیق پر بحث ہوگی۔ کانفرنس کے مختلف اجلاسوں کی صدارت پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر مسعود حسین خاں، پروفیسر اختر اورینوی، پروفیسر گیان چند جین اور پروفیسر نور الحسن ہاشمی فرمائیں گے۔ (سیاست جدید کانپور)

بہترین اخباری تصویروں پر انعامات

نئی دہلی کے دوران اخباروں میں شائع ہونے والی بہترین تصویروں پر مندرجہ ذیل افراد کو پریس انسٹی ٹیوٹ آف انڈیا اور پریس فوٹو گرافی کے انعامات ملے ہیں۔ انسانی دلچسپی کی عکاسی کے سلسلے میں پہلا انعام کشور پارکھ، اور دوسرا انعام راگھو رائے کو ملا۔ اسپورٹس کے لیے پہلا انعام ستیندر سین کو ملا۔ فوٹو فیچر کے لیے پہلا انعام راگھو رائے کو دیا گیا۔ خبروں کے سلسلے میں کوئی انعام نہیں دیا گیا۔ یہ سالانہ مقابلہ اپنے قسم کا پہلا جو ملکی سطح پر کیا گیا۔

وفیات

- انگلستان کے عہد حاضر کے عظیم ترین شاعر جان میسفیلڈ جو ۱۹۳۰ء سے اس ملک کے ملک الشعرا اور ساتھ ہی ان کا شمار اس ملک کے مرد بزرگ کی حیثیت سے ہوتا تھا انتقال کر گئے ان کی عمر ۸۸ سال کے قریب تھی۔ ان کے کلام کے ۴۷ حصے پہلے شائع ہو کر مقبول ہو چکے تھے۔ آخری اور اڑتالیسواں حصہ ۱۹۶۶ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوا تھا اور انتقال سے ایک سال قبل ان کی ایک مختلف خاکوں (اسکیچز) اور دو نظموں پر شامل کتاب شائع ہوئی تھی۔
- اپریل کے مہینے میں اردو دنیا کے دو اور اکین داغ مفارقت دے گئے۔ پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ میں اردو کے معلم جناب رام دتا مل تمنا کا حرکت قلب بند ہونے سے انتقال ہو گیا۔
- بھوپال میں اردو کے نوجوان شاعر درگا پرشاد شاد سلطانپوری ایک طویل علالت کے بعد وفات پا گئے۔ آپ مقامی اسکول میں ٹیچر تھے اور یادِ جگر نامی کتاب کے مصنف تھے۔ ادارہ ہماری زبان دونوں کے لواحقین کے ماتم میں شریک ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں

جنوبی ہند میں اردو کا موقف

۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان میں اردو بولنے والوں کی تعداد تقریباً دو کروڑ پینتیس لاکھ ہے مجموعی حیثیت سے ہندوستان کی متعدد زبانوں میں اردو کا چھٹا نمبر ہے۔ جغرافیائی نقطۂ نظر سے اردو بولنے والی آبادی ہندوستان کے دو بڑے حصوں میں منقسم ہے شمال میں اس کی اکثریت یو۔ پی اور بہار کی ریاستوں میں پائی جاتی ہے۔ جنوبی ہند میں اردو بولنے والوں کی کثیر آبادی مہاراشٹر، آندھرا پردیش اور میسور کی ریاستوں میں منقسم ہے ان ریاستوں میں بھی اردو بولنے والی آبادی کا بیشتر حصہ سابق ریاست حیدر آباد اور کرنول و کڑپہ کے اضلاع میں پایا جاتا ہے۔

شمالی ہند اور جنوبی ہند میں اردو بولنے والوں کا تناسب علی الترتیب ساٹھ اور چالیس فی صد ہے۔

جنوبی ہند میں اس چالیس فیصد کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ مہاراشٹر	۴۰ لاکھ ۲۵ ہزار	تقریباً
۲۔ آندھرا	۲۵ لاکھ ۵۳ ہزار	"
۳۔ میسور	۳۰ لاکھ ۴۳ ہزار	"
۴۔ مدراس	۶ لاکھ ۴۵ ہزار	"

مدراس سے قطع نظر جنوبی ہند میں اردو آبادی کا اجتماع ایک محدود علاقے میں پایا جاتا ہے۔ اس لیے ان کے تنظیمی مسائل اس قدر دشوار نہیں جس قدر چار ریاستوں کے وسیع رقبے کو پیش نظر رکھتے ہوئے قیاس کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً آندھرا پردیش میں جو اضلاع اردو کے نقطۂ نظر سے لائق توجہ ہیں، حسب ذیل ہیں۔

۱۔ حیدر آباد (۲) کرنول (۳) گنتور (۴) کڑپہ (۵) اننت پور (۶) نیلور (۷) چتور (۸) میدک (۹) نظام آباد (۱۰) محبوب نگر۔

ریاست مہاراشٹر میں اردو آبادی کا بڑا حصہ ان اضلاع پر مشتمل ہے (۱) بمبئی (عظیم) (۲) اورنگ آباد (۳) شولا پور (۴) جل گاؤں (۵) عثمان آباد (۶) ناسک (۷) پربھنی (۸) اکولہ۔

ریاست میسور میں بیشتر اجتماع حسب ذیل اضلاع میں پایا جاتا ہے (۱) بنگلور (۲) دھاڑوار (۳) گلبرگہ (۴) بیجاپور (۵) بلگام (۶) بیدر (۷) کولار۔

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات ظاہر ہے کہ تینوں ریاستوں میں بعض اضلاع ایسے ہیں جہاں اردو بولنے والے بہت کم تعداد میں بستے جاتے ہیں۔ تینوں ریاستوں میں سابق حیدر آباد کے اضلاع کو چھوڑ کر ہر جگہ اردو بولنے والے دو لسانی ہیں اور انھیں ریاستی زبانیں کے بولنے میں کوئی تکلف نہیں ہوتا۔

چنانچہ جنوبی ہند میں اردو کے تنظیمی مسائل کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ جن اضلاع میں اردو بولنے والوں کی آبادی ایک لاکھ یا اس سے اوپر ہے وہاں اردو تعلیمی نظام کا ڈھانچہ سرکاری یا غیر سرکاری اعانت سے قائم کیا جائے اس تعلیمی نظام میں انگریزی زبان اور ریاستی زبانیں سکھانے کا خصوصی انتظام کیا جائے۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں اردو اداروں میں موجودہ حالات کے پیش نظر انگریزی پڑھانے کا خاص طور پر اہتمام کیا جائے تو بہتر ہے یہ اس وقت تک ضروری ہے جب تک ہندی اور انگریزی کی کشمکش کا انجام بین قومی سطح پر معلوم نہ ہو جائے۔ اردو والوں کے لیے ہندی کا سیکھ لینا بہت آسان ہے اور اس بارے میں جنوبی ہند کے دوسرے باشندوں کے مقابلے میں انھیں ہمیشہ سبقت حاصل رہے گی۔

میرا خیال ہے کہ مجموعی حیثیت سے جنوبی ہند میں اردو کا حال اس قدر خستہ اور اس کا انجام اس قدر مایوس کن نہیں جس قدر کہ شمال کی ریاستوں میں پایا جاتا ہے۔ اس کا ایک بڑا سبب یہ لسانیاتی حقیقت ہے کہ اردو قدیم زمانے سے دکن میں ایک اجنبی لسانی ماحول میں قائم ہے۔ لسانیاتی انجذاب یا پیوندکاری کے امکانات شمال کے مقابلے میں یہاں بہت کم ہیں، جب کہ اردو کا ہندی میں مدغم ہو جانا سہل ہے یہ تلگو یا کنڑی میں جذب نہیں کی جا سکتی۔ تلگو یا کنڑی اردو والوں کے لیے بالکل اجنبی زبانیں ہیں، جب کہ ہندی اردو ہی کا ایک روپ ہے خاص طور پر جب کہ ہندی والوں نے اردو کے شاعروں اور ادیبوں کی تصانیف بے دھڑک دیوناگری رسم خط میں منتقل کرنا شروع کر دی ہیں یو۔ پی اور بہار کی نئی اردو داں نسل اپنے ادبی سرمایے سے اسی رسم خط میں لطف اندوز ہو رہی ہے اور پس پردہ اردو ہندی کا ایک نیا اختلاط یا "ریختہ" تیار ہو رہا ہے۔

شمالی ہند اور جنوبی ہند میں اردو کے موقف میں ایک اور بنیادی فرق بھی ہے۔ شمال میں اردو کے خلاف سخت تعصب پایا جاتا ہے جو جنوبی ہند میں موجود نہیں ایسی سیاسی فضا میں جب کہ جنوبی ریاستوں کی بین ورقی زبان کے سلسلے میں ایک مخصوص پالیسی پیش جاری ہے کچھ عجب نہیں ان ریاستوں کا اردو داں طبقہ عرصے تک انگریزی کے سہارے اپنی گاڑی چلاتا رہے لیکن جب بھی علاقائی زبانوں کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ قرار دیا گیا، اس وقت اردو داں طبقے کو یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ وہ اپنی مادری زبان میں اس کا بندوبست کرے یا علاقائی زبان کو اختیار کرے۔ دور اندیشی اسی میں ہے کہ ہم انگریزی سے غافل نہ رہتے ہوئے تاریخ کی اس کروٹ پر نظر رکھیں جو آنے والی ہے۔

اصغر عباس

سرسید کے چند نایاب مراسلات

سرسید کے مراسلات موجودہ تحقیقات کے پیش نظر اس معنی میں قدیم ہو گئے ہیں کہ ان کے بیانات کا کچھ حصہ قدرتی طور پر قابل تنسیخ ہو گیا ہے لیکن اس کے باوجود سرسید کے انداز کی خوبیاں دلیل کا استحکام اور بات کرنے کا ڈھنگ آج بھی دلنشیں اور چیتا ہے کہ ان کے مراسلات بھی ذہانے وقت سے گزر کر صحن ادب پر آگئے ہیں۔ یہاں سرسید کے کچھ نایاب مراسلے پیش کیے جا رہے ہیں جو انھوں نے انسٹیٹیوٹ گزٹ علی گڑھ کے ایڈیٹر کو لندن سے بھیجے تھے۔ یہ مراسلات سرسید کے مکاتیب کے کسی مجموعہ میں نہیں ملتے۔

سرسید کے گوناگوں کارناموں کو دیکھتے ہوئے غالباً اب یہ ثابت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ پہلی جنگ آزادی سے لے کر آج تک سرسید سے اہم اور عظیم المرتبت شخصیت قوم میں پیدا نہیں ہوئی اور اس سے شخص ہر امر قوم کی ذات سے ہے اس لئے اسے سامنے آ گیا ہے لیکن ان مراسلات کو پیش کرنے کی ایک وجہ اور بھی ہے کہ ان سے سرسید کے ذوق تحقیق، بلندی کردار اور کسی حد تک ان کے سیاسی افکار پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

سرسید جب ۱۸۶۹ء میں سمندر پار گئے تو وہاں سے انھوں نے انسٹیٹیوٹ گزٹ کو اپنے سفر کے حالات وقتاً فوقتاً بھیجتے شروع کئے تھے چنانچہ ایک خط میں انھوں نے اہل یورپ اور ہندوستانیوں کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اہل یورپ کو ہندوستانیوں سے وہی مناسبت ہے جو کسی "نہایت خوبصورت اور لائق آدمی کے سامنے نہایت میلے وحشی جانور کو ہے" اس جملہ پر یہاں کے اخباروں میں ایک طوفان برپا ہو گیا۔ حالانکہ سرسید کی قوم نا رسائیوں کے جس چکر میں گرفتار تھی اور جو حالات دکوائف تھے ان کے لیے اس سے بہتر کوئی مثال نہیں ہو سکتی تھی۔ بہر حال سرسید کو ہندوستان کے مختلف اخبارات کے مضامین کا علم ہوا جو ان کے خلاف لکھے گئے تھے تو گزٹ کے ایڈیٹر کو ذیل کا مراسلہ بھیجا جو ان کی بلندی کردار کا مظہر ہے۔

میرے شفیق ایڈیٹر اخبار سینٹیفک سوسائٹی علی گڑھ

میں نے آپ کا اخبار نمبر ۵ مطبوعہ ۱۰ر دسمبر ۱۸۶۹ء جس میں آپ نے اپنی محبت سے چند لفظ میری بابت درج اور بعض مہربان اخباروں کے جنھوں نے میری نسبت کچھ لکھا تھا ارقام فرمائے تھے دیکھا اور آپ کی محبت اور عنایت کا دلی شکر ادا کرتا ہوں۔

کوئی شخص دنیا میں ایسا نہیں ہوا جس کا کوئی نہ کوئی مخالف نہ ہوا ہو پس جس شخص کی مخالفت میں لوگ ہیں اس کا اور اس کے دوستوں کا یہ کام نہیں ہے کہ مخالفوں کی باتوں کا جواب دیتے پھریں اور بے فائدہ اور بے حاصل کام میں اپنا وقت ضائع کریں بلکہ اس کا اور اس کے دوستوں کا یہ فرض ہے کہ مخالفوں کی گفتگو کو سنیں سمجھیں اور ان کی تحریروں کو بخوشی پڑھیں اور نہایت سچائی سے غور کریں کہ حقیقت میں وہ عیب نقصان اور اس میں ہیں جو اس کے مخالفوں نے نکالے ہیں یا نہیں اگر ہوں تو ان مخالفوں کا شکر کرنا چاہیے کہ انھوں نے اپنی مہربانی سے اس عیب سے مطلع کیا اور اگر نہ ہوں تو خدا کا شکر کرنا چاہیے کہ وہ عیب جو مخالف لگاتے ہیں اس میں یا ان کے دوست میں نہیں ہیں اور کسی رد و قدح پر متوجہ ہونے کی ضرورت اس لیے نہیں کہ جو بات جھوٹی ہے وہ تھوڑے ہی زمانے میں از خود مثل جھوٹے موتی کی آب کے بے آب ہو جاوے گی خواہ وہ بات خود اس شخص کی ہو خواہ اس کے مخالف کی۔

پس میں نہایت عاجزی سے آپ کی خدمت میں التماس کرتا ہوں جو لوگ میری برائی لکھیں آپ بلاتکلف اس کو اپنے اخبار میں نقل کیجیے مگر کوئی حرف بھی اس کے جواب کے طور پر ارقام نہ فرمائیے صرف ان کی صحت و عدم صحت پڑھنے والوں کی رائے پر چھوڑ دی جاوے۔

امید ہے اپنی عنایت سے میری اس التماس کو قبول فرماویں گے۔

ان اجر اللہ علی اللہ والسلام

راقم خاکسار سید احمد

(ماخوذ از اخبار سینٹیفک سوسائٹی ۱۱ر فروری ۱۸۷۰ء)

لندن ۱۴ر جنوری ۱۸۷۰ء

سرسید لندن ہی میں تھے کہ انھیں لارڈ لارنس نے پارلیمنٹ کے افتتاحی سیشن کی کارروائیوں کو دیکھنے کے لیے مدعو کیا۔ سرسید کے ساتھ مرزا خداداد بیگ اور سید محمود بھی تھے۔ پارلیمنٹ تک پہنچے اور وہاں کی کارروائیوں کی نہایت دلچسپ رپورٹ سرسید نے گزٹ کو بھیجی تھی اور اس رپورٹ کے ساتھ ذیل کا خط بھی بھیجا تھا۔

مشفق او ایڈیٹر اخبار سینٹیفک سوسائٹی زاد عنایتہ

(باقی صفحہ ۲۴ پر)

ا مولوی شیخ اسمٰعیل پانی پتی ان چند مخصوص نفوس میں سے ہیں جنھوں نے سرسید کی تحریروں کو یکجا کر دیا ہے چنانچہ انھوں نے مکتوبات سرسید کو بھی مرتب کیا ہے۔ مکتوبات سرسید کے صفحہ ۱۸۵ پر اس خط کے کچھ حصے ملتے ہیں پورا خط یہ ہے۔

غزلیں

محمود خاور

نہ کوئی خواب نہ آہٹ نہ کوئی دھوکا تھا
چار سو وقت کا پھیلا ہوا اک صحرا تھا

تم کو دیکھا تو خیال آیا کہ برسوں جیسے
میں نے اک شعر کی مانند تمہیں سوچا تھا

رات کے خواب کو تم صبح کا محرم نہ کہو
زندگانی کا دل آویز حسیں دھوکا تھا

اے خوشی تیرے خد و خال دل آشنا ہیں بہت
غم کے سائے میں کئی بار تجھے دیکھا تھا

آرزوؤں کی وہ بستی بھی عجب بستی تھی
جس جگہ غیر تھا کوئی نہ کوئی اپنا تھا

کوچۂ دل میں ابھی آکے گزرتا ہے کوئی
دل کو ایسا بھی کئی بار گماں گزرا تھا

دیکھ کر تجھ کو یہی سوچ رہا ہے محمود
تجھ کو اے گردشِ ایام کہاں دیکھا تھا

علی عباس امید

ہر نفس پریشاں ہے، ہر نظر پشیماں ہے
کل جو زیبِ صحرا تھا آج زیبِ داماں ہے

دستِ جبر و دہشت میں زیست کا گریباں ہے
روح مر چکی لیکن جسم اب بھی لرزاں ہے

صرف دو ہی لفظوں میں تو بیانِ انساں ہے
کل بھی وہ پریشاں تھا آج بھی پریشاں ہے

آسمان و دوراں پر جز شفق نہیں کچھ بھی
خونِ نوعِ انساں ہے کتنا ارزاں ہے

زندگی کے معمارو سن کے چونکتے کیوں ہو
بے بسی و لاچاری زندگی کا عنواں ہے

کیوں نہ سرنگوں ہوگا چاند اب ترقی کا
قصرِ علم ظلمت میں بھوک کا چراغاں ہے

کچھ تو پاسِ حق رکھو اے شریف انسانو
خلق کرنے والا تو اب بھی تم پہ نازاں ہے

عبدالرحیم نشتر

نشتر جی تو گیانی ہیں
لیکن وہ بھی سیانی ہیں

کل جو سوکھے "صحرا" تھے
آج وہ "پانی پانی" ہیں

دنیا ہے "دیوانی" نشتر
لوگ "بیگانہ" "فانی" ہیں

اپنی شکل بگاڑی ہے
کچھ شکلیں پہچانی ہیں

دل میں ہے "بن جائیں خدا"
کہنے کو سیلانی ہیں

خالی خالی ہیں جو ورق
ان میں چھپے معانی ہیں

فضا کوٹڑی

چاک داماں و گریباں پہ ہے الزامِ جنوں
ابتدا یہ ہے تو کیا ہوگا انجامِ جنوں

کیا خبر ان کو جو ہیں ناواقفِ نامِ جنوں
رنگ و نکہت سے بھی مل سکتا ہے پیغامِ جنوں

پیروی آشفتگی و ازخودی دیوانگی
رفتہ رفتہ مل رہے ہیں مجھ کو انعامِ جنوں

وحشتِ دل پر جو کرتے ہیں بعض گفتگو
یا تو ناکامِ جنوں ہوتے ہیں یا خامِ جنوں

شہرتِ فرہاد و مجنوں کا یہ مطلب ہے فضا
مدعیِ شعر و سخن ہوتے ہیں بدنامِ جنوں

ذاکر صاحب کے صدرِ جمہوریۂ ہند ہونے پر

شمسی طہرانی

صدرِ جمہوریۂ ہند ہوا تو، کھلا
اب بھی مشرق میں شرافت کا نشاں باقی ہے

شیوۂ عالی کی وہ شفقتِ دلداری کے طفیل
نغمۂ وحدتِ ناقوس و اذاں باقی ہے

روحِ آزاد سرِ خلد ہے یوں نغمہ سرا
دشتِ ہستی میں محبت کی فغاں باقی ہے

جس سے حیران خرد ہو وہ جنوں جاری ہے
جس پہ قرباں یقیں ہو وہ گماں باقی ہے

تشنہ کامی کی وہ تلخیں نہ سلویٰ شاہیں
پھر بھی سرشاریٔ مستی کا سماں باقی ہے

موت چھائی ہے ہر اک سمت مگر دل میں ہنوز
شوقِ دیدارِ مسیحا نفساں باقی ہے

ابتدائے ستمِ ساقیٔ دوراں ہے مگر
انتہائے کرمِ پیرِ مغاں باقی ہے

ظلمتِ شب کا تسلط ہو سرِ چرخِ حیات
آرزوؤں کی مگر کاہکشاں باقی ہے

شدتِ قہرِ الٰہی کے ہیں آثار مگر
اعتبارِ نگہِ مہرباں باقی ہے

سر میں ماضی کے شبستاں ابھی پوشیدہ
دل میں بکھلی ہوئی شمعوں کا دھواں باقی ہے

ذوقِ پیچِ شکنِ زلف کی بن کے باوصف
کاوشِ شستگیٔ فکرِ جواں باقی ہے

جادۂ زیست پہ ہے شورشِ محشر لیکن
جرسِ قافلۂ امن و اماں باقی ہے

تجھ سے اے ذاکرِ جادو سخن و سحر بیاں
ذکرِ یاراں بحدیثِ دگراں باقی ہے

آج اے رندِ خوش انفاس [illegible]
رونقِ کارگہِ شیشہ گراں باقی ہے

ہفت افلاک کی فطرت میں بلا ہیں تمام
ذوقِ پا بوسیٔ رندانِ جہاں باقی ہے

قتل ہوتا ہو جہاں صبحِ بہاراں کا جہاں
نکہتِ دور کی ذرّوں میں رواں باقی ہے

تجھ سے ہے فلسفۂ دیں پہ تعلق کا چلن
جسم اور روح میں اک ربطِ نہاں باقی ہے

کوہ و صحرا میں یا دلبریٔ سنگ و سراب
رسمِ دلداری تسنیم و جناں باقی ہے

نغمۂ جشنِ وطن کیوں نہ سنائے شمسی
شکر صد شکر ابھی جسم میں جاں باقی ہے

رشتۂ وفا

ساحل رشید

سلگتی رات کا دل ہے کسی کی پرچھائیں
بہت قریب کسی کی مجھے صدا آئی
میں اپنے آپ میں ڈوبا ہوا انتظار کی رات
میں اپنے آپ میں کھویا ہوا انتظار کی رات
مجھے مری ہی تمنا نے آج چھیڑا ہے
مرے ہی زخم نے مجھ کو کہیں پکارا ہے
سکوتِ شب میں کوئی سایہ پھیلتا ہی رہا
ہزار تیری طرح میں اداس اداس رہا
مگر مجھے بھی مرا رشتۂ وفا نہ ملا

صفحہ ۲ سے آگے

میں آپ کے اخبار کے لیے پارلیمنٹ کے کھولے جانے کی خبر جس قدر کہ میں نے خود دیکھی آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔ زیادہ نیاز۔

راقم سید احمد
(ماخوذ از اخبار سائنٹفک سوسائٹی مورخہ ۸ اپریل ۱۸۶۶ء)
(از مقام لندن)

انڈیا آفس لائبریری میں ایک قرآن شریف موجود تھا جس کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ یہ حضرت علی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ سر سید نے اس کے متعلق تحقیق کی اور یہ مراسلہ گزٹ کو بھیجا۔

صاحب مہتمم علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ سلامت

یہ بات مشہور ہے کہ یہ قرآن خاص حضرت علی مرتضیٰ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور اس لیے میں اس کے دیکھنے کا مشتاق تھا چنانچہ میں نے اس کو دیکھا یہ پورا قرآن نہیں ہے بلکہ صرف بیس ورق ہیں نہایت خوش خط کوفی خط میں اور بلاشبہ کسی خوشنویس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں اور ان پر سنہری کام بھی بنا ہوا ہے۔

یہ قرآن آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی نے سندھ کے اسباب کے نیلام میں خریدا تھا اور اس خیال سے کہ وہ حضرت علی مرتضیٰ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اس کو نہایت عمدہ اور عجیب اور نایاب خیال کیا تھا۔

اس کی روایت یوں چلی آتی ہے کہ بعد وفات حضرت علی مرتضیٰ کے یہ قرآن مکہ میں رکھا گیا اور وہاں سے کسی وجہ سے ان سلاطین کے قبضہ میں آیا جن کی مہریں اس پر ثبت ہیں مگر یہ خود روایت ایسی لغو اور جعلی اور بے اصل معلوم ہوتی ہے جس پر ذرہ بھی یقین کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ صرف مفصلہ ذیل دلیلوں سے لوگ خیال کرتے ہیں کہ یہ قرآن حضرت علی مرتضیٰ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔

اوّل یہ کہ اس پر امیر تیمور کی مہر ہے جس کی فتوحات ۸۰۰ھ تک نہایت وسیع ہو گئی تھیں۔

دوم یہ کہ اس پر مہر و دستخط شاہ اسمٰعیل صفوی بقید ۹۱۵ھ کے ثبت ہیں۔

سوم یہ کہ اس پر مہر و دستخط شاہ اسمٰعیل ثانی اور یہ عبارت کہ اس نے یہ قرآن مجید اپنے داروغہ کتب خانہ ملک کو سپرد کیا بقید ۱۵ جلوس کے ثبت ہیں۔

چہارم دستخط شاہ عباس بھی اس پر ثبت ہیں۔

پنجم شاہ جہاں بادشاہ کے دستخط بقید ۱۰۴۵ھ اور تصدیق افضل خاں اور عنایت خاں اس کے وزیروں کی کہ یہ قرآن پندرہ سو اشرفیوں کو خریدا گیا ثبت ہے۔

ششم اس پر مہر و دستخط اعتماد خاں وزیر عالمگیر شاہ کے بھی ثبت ہیں۔

ہفتم جو صلحنامہ کہ ۱۲۰۴ھ میں درمیان میر محمد خاں و میر نور محمد خاں و میر نصیر خاں ہوا تھا وہ بھی اس کے ایک ورق پر ثبت ہے (یہ ایک رسم مسلمانان ہندوستان کی تھی کہ قرآن پر عہدنامہ لکھے جانے کو زیادہ موکد سمجھتے تھے)

پس ان تمام دلیلوں سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ ہرگاہ یہ قرآن ایسے اہتمام سے رہا ہے اور ایسا مقدس سمجھا گیا ہے تو بجز حضرت علی مرتضیٰ کے ہاتھ کے اور کس کے ہاتھ کا ہو سکتا ہے۔

میں نے اس کو بخوبی دیکھا اور چونکہ میں کوفی خط کی پرانی تحریریں اکثر دیکھ چکا ہوں اس لیے مجھ کو یقین ہوا کہ ہرگز حضرت علی مرتضیٰ کے ہاتھ کا نہیں ہے اس قسم کے خط کے لکھے ہوئے بہت سے کاغذ اور پرچے شائقین کے پاس موجود تھے اور جس مرکب روشنائی سے یہ لکھا ہوا ہے اسی کے وہ پرچے بھی تھے اور طرز تحریر اور طریقہ خوشنویسی بھی متحد اس سبب سے اس قرآن کی تحریر کا زمانہ ۸۰۰ھ سے پہلے کا کسی طرح قرار نہیں دیا جا سکتا۔

تمام مہریں اور تصدیقیں جو اس پر ثبت ہیں کسی میں ایک ذرہ بھی اشارہ اس بات کا نہیں ہے کہ اس زمانے میں بھی کسی نے اس قرآن کو حضرت علی مرتضیٰ کے ہاتھ کا لکھا ہوا خیال کیا تھا۔

اکثر لوگوں میں یہ عادت پڑ گئی ہے کہ جہاں کوفی خط میں کچھ لکھا ہوا دیکھتے ہیں اس کو حضرت علی مرتضیٰ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں اسی طرح اس کو بھی حضرت علی کے ہاتھ کا لکھا ہوا سمجھنے لگے ہیں۔

مہریں اور تصدیقیں جو اس پر ثبت ہیں بظاہر حال ان میں کچھ شبہ نہیں ہو سکتا اور ظاہراً سب اصلی ہیں اگرچہ لوگوں کا یہ طریقہ بھی رہا ہے کہ امیروں اور بادشاہوں کے پاس جعلی نشان بنا کر تحفۂ عجیب اور عمدہ کر کے لے جاتے تھے مگر بلاشبہ ان کی صحت و اصلیت کی تاریخانہ تحقیقات ہونی چاہیے۔

بہرحال ان اوراق کے پرانے اور نہایت عمدہ اور کوفی خط میں ہونے اور غایت درجہ خوش نویسی کا ہے اسی درجہ کے لکھے ہوئے ہونے میں کچھ شبہ نہیں

اور اس لیے نہایت عجیب و نہایت عمدہ ہیں۔

راقم سید احمد

از مقام لندن

(ماخوذ از اخبار سائنٹیفک سوسائٹی۔ مورخہ ۲۵ مارچ ۱۸۷۰ء)

ہندوستانی سول سروس میں ہندوستانیوں کے بار پانے سے سرسید کو ابتدا ہی سے دلچسپی تھی چنانچہ گزٹ میں سول سروس سے متعلق مضامین کا ایک طویل سلسلہ ملتا ہے۔ یہ دلچسپی اس بات سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ جب سرسید اور ان کے رفقائے کار نے مدرسۃ العلوم مسلمانان قائم کیا تو سول سروس کے لیے طلبہ کو تیار کرنے کے لیے کلاس بھی کھولی گئی تھی درج ذیل خط بھی سول سروس میں دو ہندوستانیوں کے منتخب ہونے کے سلسلے میں گزٹ کے اڈیٹر کو لکھا گیا ہے۔

صاحب مہتمم علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ سلامت

گذشتہ امتحان سول سروس میں جو لندن میں ہوا تھا چار ہندوستانی امتحان میں پاس ہوئے تھے جن میں سے دو صاحب یعنی سریندر ناتھ بازجی اور سری پدہ بابا جی ٹھاکر باشتباہ اس بات کے کہ ان کی عمر مقدار معینہ سے زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ الا واقعی ان کی عمر مقدار معینہ سے زیادہ نہیں ہے اور یہ بھی سنا جاتا ہے کہ اس کی تحقیقات عمل میں آئی اور ثابت ہوا کہ ان کی عمر مقدار معینہ سے زیادہ نہیں۔ اب مشہور ہوا ہے کہ صاحبان کمشنر امتحان نے ان کا داخلہ سول سروس میں بحال رکھا اور دو بزمرہ اہل سروس داخل ہوگئے پس ہم کو امید ہے کہ تمام اہل ہند اس خبر کے سننے سے خوش ہوں گے اور برٹش گورنمنٹ کے انصاف پر اور اس امر پر کہ وہ اپنی یورپین اور انڈین دونوں ملک کی رعایا کو ایک نظر سے دیکھتی ہے دل سے شکر گزار ہوں گے۔

راقم سید احمد

از مقام لندن

(ماخوذ از اخبار سائنٹیفک سوسائٹی مورخہ ۸ اپریل ۱۸۷۰ء)

سرسید کو تاریخ اور خاص طور سے ہندوستانی تاریخ اور اس کے باشندوں کی بود و باش سے شروع ہی سے دلچسپی رہی ہے یہاں جو مراسلہ پیش کیا جا رہا ہے وہ بھی اسی دلچسپی کا ثبوت ہے۔

صاحب اڈیٹر علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ سلامت

کتاب پیپل آف انڈیا کے (یعنی جس میں ہندوستان کی قوموں کے حالات مندرج ہیں) صفحہ ۱۲۹ میں جو بالفعل دفتر ہند میں موجود ہے۔ ایک تصویر دو راجپوت روسی اور جاٹ قوم کی ہے جس کے نام کے سبب سے سینٹ پیٹرس برگ کے لوگوں میں بڑے تعجب اور حیرت کے ساتھ چرچا ہو رہا ہے۔ چنانچہ میرے ایک دوست نے اس بات میں حسب تفصیل ذیل مجھ کو تحریر کی ہے۔

"ان کا لباس روسی ہرکاروں کے لباس سے مشابہ ہے پس یہ لوگ روس میں کیونکر آئے۔ قدیم زمانہ میں ہندوستانی بحر کیسپین میں مچھلی پکڑنے کا پیشہ کیا کرتے تھے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اسی جگہ کے رہنے والے ہیں میں خود ملتانکے ایک راجا کو جانتا ہوں جس نے بحر کیسپین میں ماہی گیری کی بابت سینٹ پیٹرس برگ میں نالش کی تھی کیا آپ اس قوم کی نسبت مجھ کو مفصل حال سے مطلع کر سکتے ہیں۔"

پس میں نہایت ممنون و مشکور رہوں گا اگر آپ کے اخبار پڑھنے والے اس قوم کی نسبت خواہ آپ کے اخبار کے ذریعہ سے مجھ کو مفصل حال سے مطلع فرما دیں یا براہ راست لندن میں ایک چٹھی میرے پاس بھیج دیں۔

آپ کا خادم

سید احمد

از مقام لندن

(ماخوذ از اخبار سائنٹیفک سوسائٹی ۳۰ جون ۱۸۷۰ء)

مراسلات

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر

مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

(مندرجہ بالا شعر کے سلسلے میں ہمارے پاس کئی مراسلات آئے ہیں یہاں ہم ان مراسلات کے ضروری اقتباسات شائع کر رہے ہیں۔ ادارہ)

اقبال نے صاف طور پر اس شعر کی وضاحت غالباً اس لیے نہیں کی کہ وہ اسے ضروری نہ سمجھتے تھے کہ شاعر خود اپنے شعر کی تشریح بھی کرے لیکن ان کا یہ چھوٹا سا پر اسرار جملہ بڑا معنی خیز ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شعر کے دونوں مفہوموں میں سے وہ کسی سے متفق نہ تھے بلکہ ان کا منشا کچھ اور تھا۔ ان کے شعر کے بیان کردہ دونوں مفہوموں میں کوئی ایسی بات بھی نہ تھی جس کو سمجھنے کے لیے مستقبل کی قید لگائی جاتی۔ سب سے حیرت انگیز یہ امر ہے کہ اگر انھوں نے اس شعر میں بھرتری ہری کا قول نظم کیا تھا تو ان الفاظ کے استعمال کا کیا موقع تھا کہ "میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں"؟ اس سے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس شعر میں انھوں نے کوئی ایسی بات کہی ہے جو ان کی اپنی ہے۔ اگر حقیقت یوں تھی تو انھیں بھرتری ہری کے قول کا حوالہ کسی اور طرح دینا چاہیے تھا اور یہ لکھنا چاہیے تھا کہ یہ شعر بھرتری ہری کے ایک قول سے متاثر ہو کر کہا گیا ہے یا اس شعر کے پس منظر میں بھرتری ہری کا ایک قول ہے۔

مجھے اندیشہ ہے کہ ان تمام الجھنوں کی وجہ سے اب اس شعر کے کوئی ایسے معنی نہیں بتائے جاسکتے جس سے سب متفق ہوں۔ لیکن اس کی ذمہ داری خود اقبال پر ہے یہ مسئلہ اب کسی استاد اور شاگرد تک محدود نہیں رہا بلکہ اقبال اور ان کے قاری کا ایک عام مسئلہ بن گیا ہے اور اس پر مزید گفتگو اسی حیثیت سے کی جاسکتی ہے۔ اگر اقبال نے بھرتری ہری کا قول نظم کیا تھا تو ایسا انداز بیان کیوں روا رکھا جس سے ایک ایسا قطعی، مکمل اور معقول مفہوم پیدا ہوگیا جو بھرتری ہری کے قول سے مختلف تھا۔ شعر کے الفاظ سے ایک صاف اور اچھا مطلب نکل آتا ہے تو قاری کو اس سے کیا غرض ہے کہ وہ یہ جاننے کی کوشش کرے کہ وہ کیا کہنا چاہتے تھے اور کیا کہہ گئے۔ اگر بھرتری ہری کے قول سے متاثر ہو کر وہ کوئی مختلف خیال نظم کرنا چاہتے تھے تو پھر انھوں نے شعر کے نیچے بھرتری ہری کیوں درج کر دیا۔ میرا خیال ہے کہ جب شعر کے صحیح مفہوم کا مسئلہ ان کے سامنے آیا تو غالباً انھیں ان دشواریوں کا احساس ہوا اور انھوں نے خود اپنا بھرم رکھنے کے لیے مبہم انداز اختیار کیا لیکن چونکہ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ دوسرے ان کے مافی الضمیر کو سمجھ سکیں اس لیے انھوں نے یہ بھی لکھ دیا کہ "میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اسے آنے والا وقت بخوبی سمجھ سکے گا۔"

اس شعر میں اقبال جو کچھ کہہ سکے وہ تو وہی سیدھا سادہ لیکن پُرزور مفہوم ہے جو اس کے صاف پیرایہ بیان سے نکلتا ہے رہ گیا ان کے قول کی روشنی میں یہ سوال کہ وہ کیا کہنا چاہتے تھے تو یہ نہ تو وہ ہے جس کا ابھی ذکر کیا گیا اور نہ انھوں نے بھرتری ہری کے قول کا من وعن ترجمہ کیا ہے۔ اس کا تعلق ان کی شاعری کی اثر آفرینی سے ہے جس سے ایک تیسرا مفہوم پیدا ہوتا ہے انھوں نے بھرتری ہری کے قول کو اس اہم فرق کے ساتھ نظم کیا ہے کہ جو بات بھرتری ہری کے لیے ایک مسلمہ حقیقت ہے وہ ان کے لیے ایک غور طلب نکتہ ہے۔ ان کا مدعا یہ ہے کہ اس قول کی عدم صحت یا صحت اس سے ثابت ہو سکتی ہے کہ بالترتیب ان کے قارئین پر ان کے کلام کا وہ اثر ہوتا ہے یا نہیں ہوتا جو وہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اقبال ہر دوسرے شخص کو مردِ ناداں سمجھتے تھے۔ چونکہ جس وقت انھوں نے یہ شعر کہا ہے اس وقت ان کو اس کا اندازہ ہو چکا تھا کہ مردِ ناداں پر اس کا اثر ہو رہا ہے اس لیے انھوں نے بھرتری ہری کے قول کو استفہامیہ اور استعجابیہ انداز کا مجموعہ بنا دیا ہے۔ اس شعر میں گویا وہ یہ سوال کر رہے ہیں کہ کیا میرے کلام کی روشنی میں بھرتری ہری کا یہ مشہور قول صحیح ہے کہ مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک کا اثر نہیں ہو سکتا۔ دوسرے مصرعے کو بھی سوالیہ انداز میں پڑھا جائے تو یہ مفہوم آسانی سے ذہن نشین ہو جائے گا۔

مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر؟
(ابو محمد سحر)

(۲)

میرے خیال میں اس شعر کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے اس کے پس منظر پر بھی ایک نظر ڈال لینا ضروری ہے۔

یہ شعر بالِ جبریل کے سرنامہ پر افتتاحیہ شعر کی حیثیت رکھتا ہے۔ بالِ جبریل علامہ کے آخری دور شاعری کا کلام ہے جس میں سنجیدہ علمی نکات اور فلسفیانہ مباحث کو نرم و نازک الفاظ کی ترکیب سے مترنم اور سامعہ نواز اشعار کے قالب میں ڈھالا ہے۔ علامہ کا خطاب بالعموم اقوامِ مشرق اور بالخصوص ملتِ اسلامیہ سے ہے جو مغرب کے استعمار کی گرفت اور استبداد کے پنجے میں پھنس جانے کی وجہ سے اپنی ذہنی صلاحیتیں بھی کھو بیٹھی تھیں اور اپنے ماضی سے بے خبر، حال سے ناآشنا اور مستقبل سے غافل ہو کر علم و عمل سے عاری ہو گئی تھیں۔ علامہ ان کو بھولی ہوئی داستان یاد دلاتے ہیں۔ قوموں کے عروج و زوال کے اسبابِ علل

پرجست گر کے ابھرنے کے لیے علم و عمل پر اکساتے ہیں۔ مگر ذہنی پستی علمی بے مائگی اور عملی تہی دستی کی وجہ سے قوم کا یہ عالم ہو گیا ہے کہ علامہ کے فلسفیانہ نکات ان کی سمجھ سے بالاتر ہیں۔ علامہ عقل و فہم کے اس عام فقدان سے گھبرا جاتے ہیں اور بھری انجمن میں اپنے کو تنہا محسوس کر کے چلا اٹھتے ہیں ؎

من مثال لالۂ صحرا استم
درمیان محفلے تنہا استم
دل بدوش و دیدہ بر فردا استم
درمیان انجمن تنہا استم

ایک جگہ تو وہ خود کو اس زمانہ کا شاعر ہی نہیں سمجھتے بلکہ اس آنے والے زمانہ کا نقیب سمجھتے ہیں جبکہ لوگوں میں زیادہ عقل و فہم کے حصول کے بعد سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوگی چنانچہ فرماتے ہیں۔

"من نوائے شاعر فردا استم"

علامہ کے آئینہ گفتار میں ہوشمندی کے ساتھ آنکھیں کھول کر دیکھنے والوں کو ہی مستقبل کے خد و خال نظر آ سکتے ہیں ؎

کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

ہم اسی پس منظر کو سامنے رکھ کر اس شعر کا تجزیہ کرتے ہیں۔

شعر کا پہلا مصرعہ مثبت ہے اور ایک حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے۔ پھول کی پتی نرم و نازک کلام کا استعارہ ہے اور ہیرے سے مراد سخت مگر جوہر قابل شخص ہے۔ جگر کاٹنا یعنی اثر انداز ہونا ہے۔ اب شعر کا مفہوم یہ ہے کہ نرم سے نرم چیز سے ہیرا کٹ سکتا ہے مگر مرد ناداں پر نرم و نازک کلام کا اثر نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ ہیرا جمادات میں سب سے زیادہ سخت پتھر ہے جس کو کوئی سخت سے سخت دھات بھی نہیں کاٹ سکتی اگر کاٹ سکتا ہے تو ہیرے کو ہیرا ہی کاٹ سکتا ہے ایسی سخت چیز پر کسی نرم و نازک چیز کا اثر ہونا بظاہر ناممکن ہے۔ مگر حقیقت اس کے خلاف ہے۔ ہیرا سخت ہونے کے باوجود جوہر قابل ہے۔ اس میں عکس گیری اور اثر پذیری کی صلاحیت ہے۔ سورج کی شعاعوں اور اپنے گرد و پیش کے ماحول سے متاثر ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ الماس، زبرجد، لعل و زمرد، نیلم و پکھراج اور عقیق و مرجان سب ہیرے ہی ہیں لیکن مختلف ماحول میں مختلف رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ ان کی یہ رنگا رنگی اثر پذیری کا نتیجہ ہے ماہر طبقات الارض اور جوہر شناس اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں۔ اکثر جواہرات میں کچھ نقش و نگار اور نشانات بھی پائے گئے ہیں جو ماحول کی عکاسی کا بین ثبوت پیش کرتے ہیں۔ استعارے کے پردے کو ہٹا کر اب شعر کا مطلب یہ ہوا کہ پھول کی پتی جیسے نرم و نازک کلام کا اثر ہیرے کی طرح سخت سے سخت انسان پر بھی ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہ ہیرے کی طرح جوہر قابل بھی ہو اور اثر پذیری کی صلاحیت رکھتا ہو لیکن مرد ناداں ایسا سخت سنگ سیاہ ہے کہ وہ نرم نازک باتوں سے متاثر نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس میں وہ قابلیت کا جوہر اور اثر پذیری کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ گویا نادانی تاثر کے راستہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے باایں ہمہ علامہ کو یقین تھا کہ آنے والا وقت نادانی کی اس چٹان کو ہٹا دے گا اور اس وقت ہیرے جیسے جوہر قابل پیدا ہوں گے اور ان کے نرم و نازک کلام کا ان پر یقیناً اثر ہوگا علامہ کے اس خواب کی تعبیر کسی حد تک ان کی زندگی میں ہی پوری ہونے لگی تھی۔ چنانچہ چند ہمنواؤں کے مل جانے پر مسرت و شادمانی سے سرشار ہو کر بے اختیار بول اٹھتے ہیں ؎

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

اور یہی ہوا کہ وقت کے ساتھ ساتھ ان کے پروانوں کی تعداد پوری شمع محفل پر چھا گئی۔ علامہ کے اس فقرے کا بھی یہی مطلب ہے کہ "میں جو کچھ کہتا ہوں اسے آنے والا وقت بخوبی سمجھ سکے گا۔"

الغرض شعر موضوع بحث کو شاعرانہ مناسبتوں اور برمحل تشبیہ و استعارے کی ترکیب نے جادو بنا دیا ہے۔ اور جب ہماری رسائی علامہ کی فطرت شناسی تک ہوتی ہے تو حیرت و استعجاب کے ساتھ ان کی پر از معلومات صنعت گری کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

رفعت صاحب کے مراسلے میں بھرتری ہری کے اشلوک کے ترجمہ کے ساتھ ساتھ چار نکتہ رس سخن فہموں کے مفہوم دیئے گئے ہیں۔

چاروں مفہوم اپنی اپنی جگہ خوب و مرغوب۔ بھرتری کا خیال صحیح و درست۔ مگر ہیرے کی صلاحیت سے علامہ نے جو نکتہ پیدا کیا ہے اس کی طرف کسی کی نظر نہیں گئی۔ تشبیہ اعلیٰ کی اعلیٰ ترین۔ اور ادنیٰ کی ادنیٰ ترین شے سے دی جاتی ہے نہ کہ اس کے برعکس۔ ناداں جیسے سنگ سیاہ کی ہیرے جیسی درخشاں اور بیش قیمت چیز سے۔ بھرتری ہری کی نظروں سے جو نکتہ اوجھل ہو گیا تھا علامہ کی فطرت شناس نظروں نے اسے تاڑ لیا۔ اور اپنی صنعت گری سے اس کے نقص کو دور کر دیا۔ کسی کے خیال کا چربہ اتار لینا اور بات ہے مگر اس خیال میں اپنی جدت طبع سے چار چاند لگا دینا بہت بڑی صنعت گری ہے۔

(تفضل حسین ایم اے)

(۳)

اس سلسلے میں دو باتیں غور طلب ہیں۔ ایک تو یہ کہ شعر کے

الفاظ سے جو مفہوم سمجھ میں آتا ہے وہ کیا ہے اور کتنے مختلف مفہوم ان الفاظ سے نکل سکتے ہیں اور پھر یہ کہ ان مختلف مفہوموں میں کسے ترجیح حاصل ہے اور کیوں؟ دوسری یہ کہ علامہ اقبال کے ذہن میں جو اس شعر کا مفہوم ہے وہ شعر کے الفاظ سے ظاہر ہونے والے مختلف مفہوموں میں سے ہی کوئی مفہوم ہے یا علامہ کے ذہن میں کوئی دوسری ہی بات ہے۔

پہلی بات کے بارے میں عرض یہ ہے کہ اس شعر کے پہلے مصرع کی حیثیت صرف ایک شاعرانہ دعوے کی قرار دی جاسکتی ہے یا اس کو استعجاب قرار دے سکتے ہیں۔

دوسرے سوال کے بارے میں یہ عرض ہے کہ سائل کو علامہ اقبال کے ارشاد سے یہ مغالطہ ہوا ہے کہ شعر کے الفاظ سے ظاہر ہونے والے ان دونوں مفہوموں کے علاوہ کوئی دوسرا مفہوم علامہ کے ذہن میں ہے اور وہ مفہوم بھی ان الفاظ ہی سے سمجھا جاسکتا ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ علامہ کے ذہن میں جواب دیتے وقت شعر کا کوئی تیسرا مطلب نہیں تھا۔ انھوں نے جس وقت یہ بات لکھی تو وہ صرف اس بات کا اظہار کر رہے تھے کہ آنے والا وقت ہی یہ بتائے گا کہ وہ ہستی جو اس شعر کا مصداق ہے اور جس کو پیش نظر رکھ کر علامہ نے اس خیال کو شعر کا جامہ پہنایا ہے اس نے کہاں تک اپنی نادانی کی قبا اتار کر دانائی و فراست سے کام لے کر علامہ کے کلام سے وہ نمایاں حاصل کی ہے اور اس سے تاثر پذیر ہوئی ہے۔ ورنہ انھیں اس بات سے کوئی زیادہ دلچسپی نہیں تھی کہ الفاظ سے ظاہر ہونے والے دونوں مفہوموں میں سے کسے ترجیح دی جائے۔ کیونکہ اقبال کے نزدیک شاعری اصل مقصود نہیں بلکہ انھیں اس کے پردے میں ایک پیغام پہونچانا ہے۔ اس طرح یہ جواب اور اس کی وہ توجیہ جو ہم نے پیش کی ہے علامہ کے رجحان طبع اور مذاق سے زیادہ قریب ہے۔

(محمد انجم آزاد انجم)

(۴)

۲۲ر اپریل کے ہماری زبان میں جناب مبارز الدین رفعت کا مراسلہ مندرجہ بالا عنوان سے گزرا میں سب سے پہلے اس اشلوک کا لفظی ترجمہ پیش کرنا چاہتی ہوں جس سے اقبال کا یہ شعر ماخوذ ہے تاکہ اس سے براہ راست استفادہ کیا جاسکے۔

جو شخص مدھر وچنوں (نصیحتوں) کے ذریعے کسی شیطان آدمی کو نیک راہ پر لے جانا چاہتا ہے تو وہ خوفناک ہاتھی کو کچے کمل کے ڈنٹھل کے ریشوں سے باندھنے کی کوشش کرتا ہے (یا) سرس کی نرم و نازک نوک سے ہیرے میں چھید کرنے کی سعی کرتا ہے (یا) امرت کی ایک بوند سے نمکین سمندر کو میٹھا بنانے کی (ناکام) کوشش میں لگا ہوا ہے۔

اب اقبال کا یہ شعر پڑھئے:

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

اقبال کا یہ شعر بھرتری ہری کے اشلوک کے مفہوم کے مطابق ہے۔ اشلوک میں بیان کردہ تمام چیزیں ناممکن ہیں کوئی بھی ممکن نہیں۔ سید مبارز الدین رفعت نے صحیح فرمایا ہے کہ راحت سعید خاں کا مفہوم وہی ہے جو ان دونوں شارحوں کا ہے لیکن جہاں تک بھرتری کے اشلوک کا تعلق ہے وہ ان تمام شارحین اشلوک کا ترجمہ پڑھئے ہر بات کا جواب نفی میں ملے گا۔

اب آل احمد سرور کا مفہوم ملاحظہ ہو:

"بھلا پھول کی پتی ہیرے کو کاٹ سکتی ہے؟ اور جب پھول کی پتی سے ہیرا نہیں کٹ سکتا تو ناداں انسان پر نرم و نازک نصیحت کیونکر کارگر اور اثر انداز ہوسکتی ہے۔"

بھرتری ہری کے اشلوک کا مفہوم آل احمد سرور کے مفہوم کے مطابق ہے اقبال نے اسے کس مفہوم میں استعمال کیا تھا یہ وہ بہتر جان سکتے ہیں یا بقول ان کے آنے والا وقت بخوبی سمجھ سکتا ہے لیکن جہاں تک میں سمجھی ہوں اور جہاں تک ماخذ کا تعلق ہے یہی مفہوم پورا اترتا ہے۔

استعجابیہ انداز نے شعر کو جو حسن عطا کیا ہے وہ مثبت انداز میں پیدا نہیں ہوتا۔　(قیصر جہاں)

(۵)

پھول کی پتی سے ہیرے کے جگر کا کٹنا ایک سچائی ہے اس مفہوم میں پتی کی نرمی سے مرد ناداں کی ذہنی جمود کی سختی میں مشابہت قائم ہوتی ہے اور ایک ٹھوس مادی حقیقت کے ذریعہ سے ذہنی دنیا میں چھپے ہوئے جمود کی سختی کو سمجھایا جا رہا ہے۔ اس مفہوم میں نرم و نازک پھول کی پتی اور نرم و نازک شاعرانہ کلام کے اثرات میں مشابہت پائی جاتی ہے۔ اب ذرا دوسرے مفہوم کو ملاحظہ فرمایئے "یہ تو ممکن ہے کہ پھول کی پتی سے ہیرے کا جگر کاٹ کر رکھ دیا جائے لیکن مرد ناداں پر نرم و نازک بات کا اثر ہو یہ ناممکن ہے" یہاں پر ایک ناممکن کو ممکن مان لیا ہے کہ پھول کی نازک پتی سے ہیرے کے جگر کا کٹنا خیالی دنیا میں ہی ممکن ہوسکتا ہے۔ اس قسم کی خیال پیدا وار کی تائید میرزا سودا، میر انشاء اللہ خاں انشا، ذوق اور رجب علی بیگ سرور کی ادبی کاوشوں کے ذریعہ سے تو کی جاسکتی ہے مگر اقبال جس دور کے آدمی تھے اس دور میں علم اور عقل کا تقاضہ کچھ اور ہوگیا تھا؟ دوسرا غور طلب نکتہ اس سلسلہ میں یہ ہے کہ پہلے مفہوم میں نزاکت کا کام ایک ہے اور فطری صداقت کو لیے ہوئے ہے دوسرے مفہوم میں نزاکت کے کام دو ہو جاتے ہیں ایک طرف وہ ہیرے کا جگر کاٹ سکتی ہے دوسری طرف وہ مرد ناداں کے ذہنی جمود کو نہیں توڑ پاتی ہے۔

دوسرے مفہوم کے ان متضاد پہلوؤں کو دیکھتے ہوئے ایک خیالی بات کو حقیقت کے سامنے رکھ کر تو نا حقیقت کو نمایاں کرنے کے لیے فرض کیا گیا ہے ورنہ ایک خیالی بات کو حقیقت سے مناسبت کیا۔ (حسن عسکری لکھنوی)

شمالی ہند میں اردو تیسری زبان کے طور پر پڑھائی جائے

کانگریس ورکنگ کمیٹی میں تجویز

نئی دہلی۔ زبان کے مسئلہ پر کانگریس ورکنگ کمیٹی میں بحث محدود رہی مگر کابینہ میں تفصیل سے بحث ہوئی۔ دونوں میٹنگوں میں اس بات پر زور دیا گیا کہ مدراس یا کسی دوسرے غیر ہندی ریاست میں ہندی کی لازمی تعلیم کا فیصلہ وہاں کی حکومت کے مشورے سے کیا جائے۔

کابینہ کے اجلاس میں اس بات پر زور دیا گیا کہ تیسری زبان پڑھانے کے سلسلے میں جنوب کی زبانوں کو ترجیح دی جائے۔

خیال کیا جاتا ہے کہ نائب وزیر اعظم جناب مرارجی ڈیسائی نے کہا کہ یہ موقف اختیار کرنے کی صورت میں جنوب میں ہندی کو مقبول بنانے میں مدد ملے گی کیونکہ وہاں قومی زبان سیکھنے کے بارے میں کچھ غلط فہمیاں ہیں۔

ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں کچھ ممبران نے یہ تجویز رکھی کہ شمالی ہندوستان میں تیسری زبان کے طور پر اردو پڑھانے کی اجازت دے دی جائے ورنہ اقلیتی طبقوں کے بچوں کو چار زبانیں پڑھنی پڑیں گی۔

اس بات کا امکان ہے کہ زبان کا مسئلہ ورکنگ کمیٹی کے سامنے اس وقت پھر آئے گا جب مرکزی حکومت لسانی بل کو ریاستی حکومتوں سے مشورے کے بعد قطعی صورت دے دے گی۔ (الجمعیۃ)

اردو کے بارہ میں صرف غور کرنے کا وعدہ

لکھنؤ۔ اترپردیش کے نائب وزیر اعلیٰ جناب رام پرکاش نے ایک تحریر کے ذریعہ اترپردیش میں اردو کے جائز حقوق دیے جانے کے سلسلے میں صرف ضرور غور کیا جائے گا، کی یقین دہانی کی ہے۔

انھوں نے یہ تحریر ادارہ فروغ اردو ہند کے سکریٹری کو ان کے اس خط کے جواب میں بھیجی ہے جو ادارہ نے اردو کی بے دخلی بند جانا طالب علموں کو اردو تعلیم کی سہولت کا مطالبہ کرتے ہوئے لکھا تھا۔

خط میں نائب وزیر تعلیم سے ان کی سرکاری اور جماعتی لسانی پالیسی کی بھی وضاحت چاہی گئی تھی۔

نائب وزیر اعلیٰ کے جواب پر ادارہ فروغ اردو کی مجلس انتظامیہ اس پر غور کرے گی۔ (قومی آواز)

اردو ہندوستان کے تہذیبی اتحاد کا نشان ہے

یوپی کے نئے گورنر کی رائے

نئی دہلی۔ کے گورنر بی گوپالا ریڈی نے آج یہاں اردو کو ہندوستان کے تہذیبی اتحاد کا نشان قرار دیا اور کہا کہ میں خوش قسمت ہوں کہ میرا اب تک ایسے مقامات سے رابطہ رہا ہے جہاں اردو پروان چڑھی۔ انھوں نے کہا کہ میرا تعلق حیدرآباد سے ہے۔ میں کچھ عرصے دہلی میں رہا ہوں اور اب یوپی میں ہوں۔ یہ بات انھوں نے ایک تقریب میں کہی جو ان کے اعزاز میں دی گئی تھی۔ (دعوت)

اردو کی حمایت میں بہار میں مارکسی کمیونسٹوں کا مظاہرہ

پٹنہ۔ مارکسی کمیونسٹ پارٹی کی بہار ریاستی کمیٹی ۵رجون کو بہار اسمبلی کے سامنے اس غرض سے مظاہرہ کرنے والی ہے کہ سنگھٹ ودھایک نے اپنے دور وزارت میں کم از کم ۳۳ متفقہ پروگراموں میں سے ایک پروگرام پر بھی عمل نہیں کیا۔

چنانچہ جلسہ نے طے کیا کہ ریاست گیر عوامی تحریک چلائی جائے تاکہ حکومت ترقی پسندانہ تجویزوں میں سے کم از کم چند تجویزوں پر عمل کرے جن میں اردو کو ریاست میں دوسری سرکاری زبان بنانا بھی شامل ہے۔

(آزاد ہند)

انجمن ترقی اردو بنگال کا جلسہ

حال میں انجمن ترقی اردو کی شاخوں کے نمائندوں کا ایک اہم جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں یہ طے پایا کہ چونکہ شاخوں کی ممبر سازی میں کافی تاخیر ہو چکی ہے اس لیے مقامی شاخوں کی تشکیل کی آخری تاریخ ۳۱رمئی ۱۹۷۷ء مقرر کی جائے اور جون کے اندر ضلعی اور ریاستی شاخ کی تشکیل مکمل کرلی جائے۔

اس فیصلہ کے پیش نظر شاخوں کی ہدایت کی جاتی ہے کہ ممبر سازی جلد از جلد ختم کرکے ۳۱رمئی ۱۹۷۷ء تک انتخابات مکمل کرلیں۔

جن علاقوں میں ممبر سازی کی رفتار سست ہے وہاں ریاستی شاخ کے نمائندے مذکورہ تاریخوں کے درمیان دورہ کر رہے گئے۔

اسی جلسہ میں مدرسہ عالیہ کلکتہ کے اردو داں ہیڈ ماسٹر کی جگہ پر ایک بنگلہ داں ہیڈ ماسٹر کے تبادلہ پر انتہائی رنج کا اظہار کیا گیا اس لیے کہ کلکتہ بلکہ بنگال میں مدرسہ عالیہ ہی یہاں کا واحد گورنمنٹ اسکول ہے جہاں اردو ذریعہ تعلیم ہے۔

اس جلسہ میں یہ طے کیا کہ انجمن کا ایک وفد جلد از جلد وزیر تعلیم سے مل کر اس پوزیشن سے آگاہ کرے اور اس تبادلہ کے آرڈر کو واپس لینے کی درخواست کرے۔ (آبشار)

راجستھان میں اردو کے لیے فال نیک

لسانی اقلیتوں کے نائب کمشنر الہ آباد سے اردو زبان کی مشکلات کا جائزہ لینے کے لیے کوٹہ تشریف لائے۔ کلکٹر صاحب کوٹہ کے چیمبر میں انجمن ترقی اردو کوٹہ کے وفد نے انجمن ہذا کے صدر جناب بھویر پرشاد صاحب ایڈوکیٹ کی قیادت میں ملاقات کی وفد جناب پروفیسر حافظ حکمت علی صاحب، حافظ عبدالحلیم صاحب

ممبر وقف بورڈ راجستھان، محمد ... صاحب ایڈوکیٹ، سابق صدر انجمن، وکیل یامین صاحب ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی (علیگ) اور عبدالرحیم صاحب ایڈوکیٹ سکریٹری انجمن ترقی اردو کوٹہ پر مشتمل تھا۔ سکریٹری موصوف نے اردو طلبہ کے داخلے کے وقت۔ نصاب کی کتب اور مدرسین کی کمی پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ جناب گراوت صاحب انسپکٹر (وف) اسکولز کوٹہ کو اقلیتی زبان کا رجسٹر رکھنے کی طرف توجہ دلائی گئی۔ باٹن پول مڈل اسکول اور رامپورہ گورنمنٹ مڈل اسکول کے ہیڈ مدرسین کا اردو طلبہ کے داخلے میں رکاوٹ پیدا کرنے کی شکایت کی گئی اور سکریٹری انجمن ہٰذا نے مندرجہ ذیل میمورنڈم نائب کمشنر لسانی اقلیت الٰہ آباد کو پیش کیا۔ میمورنڈم کی ایک نقل جناب برکت اللہ خاں صاحب وزیر تعلیم راجستھان اور ایک نقل جناب احترام الدین صاحب شاغل جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو راجستھان کو بھجوائی گئی۔

میمورنڈم تو پیش کر دیا گیا ہے

اور انجمن ترقی اردو راجستھان اردو کے سلسلے میں کافی جدوجہد کر رہی ہے لیکن یہ امر قابلِ افسوس ہے کہ محبان اردو کما حقہ فائدہ نہیں اٹھاتے ہیں۔ گذشتہ سال راجستھان بورڈ کے سکنڈری اور ہائر سکنڈری کے امتحانات میں شرکت کرنے والے طلبہ کی تعداد تسلی بخش نہیں رہی۔ سکنڈری کے سہ لسانی پرچے اردو میں ۲۱۶ امیدوار شریک ہوئے۔ اور اختیاری مضمون اردو میں ۱۲۵ امیدوار امتحان میں بیٹھے ہائر سکنڈری اردو اختیاری پرچے میں ۷۷ طالب علموں نے شرکت کی۔ راجستھان میں محبان اردو کی تعداد کو دیکھتے ہوئے شرکاء طلبہ کی تعداد مایوس کن ہے۔ محبان اردو کو چاہیئے کہ سہ لسانی زبان میں ہر بچے کو اردو دلوائیں اور سائنس اور کامرس کے طلبہ تھرڈ لینگویج اردو لینے پر توجہ دلائیں۔ اور جو طلبہ آرٹس کے مضامین لیں وہ ہسٹری، جغرافیہ، سیوکس کے مضامین کے ساتھ اختیاری مضمون اردو ضرور لیں۔ تاکہ ان کی زبان صاف ہو سکے اور تقریر و تحریر میں وزن پیدا ہو۔

(عبدالرحیم ایڈوکیٹ سکریٹری انجمن ترقی اردو کوٹہ)

اردو کو بہار کی ثانوی سرکاری زبان کا درجہ دینے کے لیے غیر سرکاری بل

کانگریسی ایم۔ ایل۔ اے جناب راجہ نصیر الدین حیدر خاں نے بہار آفیشیل لینگویج ایکٹ ۵۰ء میں ترمیم کے لیے ترمیمی بل بہار اسمبلی میں پیش کرنے کی نوٹس دے دی ہے۔ جس پر اسمبلی میں آئندہ اجلاس میں بحث ہونے کی توقع ہے۔

جو ترمیم راجہ نصیر الدین حیدر خاں نے اسمبلی میں پیش کی ہے اس کا ماحصل حسب ذیل ہے۔

(۱) اس ایکٹ کا نام بہار آفیشیل لینگویج (ترمیمی) ایکٹ ۱۹۷۰ء ہوگا اور اس کا نفاذ ریاست بہار میں بل پاس ہونے پر فوراً ہوگا۔

(۲) بہار آفیشیل لینگویج ایکٹ ۱۹۵۰ء کے دیباچہ میں لفظ "ہندی، دیوناگری رسم الخط میں" کے بعد لفظ "اور اردو فارسی رسم الخط میں" بڑھا دیا جائے گا۔ اور "زبان" کی جگہ پر "زبانوں" کا استعمال ہوگا۔ اور اسی طرح بہار آفیشیل لینگویج ایکٹ ۱۹۵۰ء کے دفعہ ۲ میں بھی ترمیم ہوگی۔

بل کی ضرورت کی وجہ

اس بات کی بہت زمانہ سے ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ ہندی کے ساتھ ساتھ اردو کو بھی سرکاری درجہ دیا جائے، تاکہ ہندی ہندی کی ترقی کے ساتھ ساتھ قومی اتحاد کو بھی فروغ حاصل ہو اور اس کی ضرورت محسوس کی گئی۔ کہ جب دستور ہند میں اس کو جگہ دی گئی ہے تو اس کام کو فوراً بروئے کار لایا جائے ان وجوہات کے پیش نظر یہ بل پیش کی جا رہی ہے کہ اردو زبان کو بھی بحیثیت سرکاری زبان یا دوسری سرکاری زبان کو بھی مندرجہ ذیل کاموں کے لیے منظور کر لیا جائے۔

الف۔ ان طلبہ کے لیے جن کی مادری زبان اردو ہے یہ زبان پرائمری اور سکنڈری درجات تک ذریعہ تعلیم رہے گی۔

ب۔ اردو والوں کو اس بات کی اجازت ہوگی کہ اردو زبان میں یو شنداشتیں، درخواستیں بیان تحریریاں، عرضی دعوی اور دیگر درخواستیں بعدالت فوجداری و منصفی، دفتر مالیات، سرکاری اور غیر سرکاری دفتروں، لوکل بوڈ، پولیس تھانہ عوامی دفتروں اور رجسٹری آفسوں میں بحث کی اجازت بھی ہوگی۔

ج۔ تمام نوٹس، سرکاری اعلانات، قوانین بجٹ، سرکاری ہدایات پریس نوٹ اور جتنے قسم کے فارم سرکار کی طرف سے جاری کئے جاتے وغیرہ ووٹر لسٹ اور عوام کی ضرورت کی تمام چیزیں جو سرکار کی طرف سے جاری ہوں وغیرہ راشن کارڈ پر سرکاری دفتر پر سڑک اور ڈاک خانہ پر ضروری ہدایات وغیرہ اردو میں بھی ہونی چاہیئے۔

د۔ اردو بولنے والے ممبران اسمبلی کو اس بات کی اجازت ہونی چاہیے کہ وہ اسمبلی کو اردو زبان میں خطاب کریں اور ان کی تقاریر اردو زبان میں ضبط تحریر لائی جائیں اور ٹھیک اسی طرح اسمبلی میں سوالات وغیرہ بھی اردو میں کرنے کی اجازت دی جائے، وغیرہ اسمبلی کی تمام کارروائیاں اردو میں شائع شدہ ملنی چاہیئے۔

------x ÷ x-----

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، پرنٹر ظہیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس میں چھاپا اور پبلشر ... نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا